سمجھا جاتا ہے اور مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ حلالہ کے بغیر اس عورت سے دوبارہ نکاح کر لے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہی صورت رائج ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین کے آرڈی نینس مجریہ ۱۹۶۱ء کے تحت طلاق سوائے اس صورت کے جبکہ اس سے رجوع کر لیا گیا ہو، یونین کمیٹی کے چیئرمین کو خاوند کی جانب سے جس نے طلاق دی ہے، قطع نظر اس امر کے کہ ایک طلاق دی ہے یا دو یا تین یا زیادہ طلاقیں اور یہ کہ ایک وقت میں دی ہیں یا مختلف اوقات میں، طلاق کا نوٹس ملنے کی تاریخ سے نوے دن گزر جانے کے بعد موثر ہوتی ہے۔

قانون وراثت میں روایتی قانون کے مطابق یتیم پوتے پوتیاں اپنے دادا کی وراثت سے محروم رہتے ہیں، لیکن مصر کے قانون انتظام وصیت مجریہ ۱۹۴۶ء کے تحت لازمی میراث کا طریقہ رائج کیا گیا ہے جس کے مطابق یتیم پوتوں اور پوتیوں کو اپنے دادا کی میراث میں اتنے حصے کا مستحق قرار دیا گیا ہے جتنا حصہ ان کے والدین کو زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔ تاہم یہ حصہ کل میراث کے ایک تہائی حصے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔''

اسی ضمن میں زیر بحث آنے والے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ اس حوالے سے مختلف اوقات میں درج ذیل تحریروں نے الشریعہ میں جگہ پائی جن میں سے یہ رجحان پیش کیا گیا تھا کہ بحالات موجودہ عملی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جائے:

مسئلہ طلاق ثلاثہ۔ علماء کرام توجہ فرمائیں۔ ڈاکٹر محمد اکرم ورک (جون ۲۰۰۵ء)

مسئلہ طلاق ثلاثہ اور فقہائے امت۔ محمد افتخار تبسم نعمانی (جون ۲۰۰۶ء)

ان کے تقابل میں حضرت شیخ الحدیث کی درج ذیل تحریر بھی بحث میں شامل کی گئی:

تین طلاقوں کے بارے میں جمہور کا موقف۔ مولانا سرفراز خان صفدر (جولائی ۲۰۰۶ء)

الشریعہ میں شائع ہونے والے درج ذیل مضامین میں بہت سے ایسے فکری سوالات اٹھائے گئے ہیں جو اپنے نظری اور عملی حل کے لیے اہل علم کی توجہ کے منتظر اور غیر روایتی زاویہ نظر کے متقاضی ہیں:

مسلمان معاشرے اور تعلیمات اسلام، فکری کنفیوژن کیوں؟ ارشاد احمد حقانی (جولائی ۲۰۰۲)

عصر حاضر میں اسلامی فکر۔ چند توجہ طلب مسائل۔ نجات اللہ صدیقی (جولائی ۲۰۰۲)

فکری مسائل کے حوالے سے چند اہم گزارشات۔ ابو عمار زاہد الراشدی (جولائی ۲۰۰۲)

عالم اسلام کے فکری مسائل۔ خورشید احمد ندیم / منظور الحسن (اگست ۲۰۰۲)

مسلم امہ کو درپیش فکری مسائل۔ ڈاکٹر محمد امین (فروری ۲۰۰۳ء)

فکر اسلامی کو درپیش عصری چیلنج۔ تجمد اور تجدد کے درمیان راہ توسط کی تلاش۔ ڈاکٹر محمد امین (ستمبر ۲۰۰۷ء)

علمی وفکری مسائل سے متعلق راقم الحروف کی بہت سی غیر روایتی آرا بھی گزشتہ کافی عرصے سے بحث ومباحثہ اور نقد وجرح کا موضوع ہیں اور روایتی مذہبی فکر سے وابستہ اہل علم اپنے زاویہ نظر سے بجا طور پر ان سے شدید اختلاف

رکھتے ہیں۔ والد گرامی نے اس ضمن میں بھی اپنا نقطہ نظر حضرت شیخ الحدیثؒ کی حیات میں ایک سے زائد مرتبہ واضح کیا اور اس نوع کی وضاحتیں متعدد بار الشریعہ کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر اپریل/مئی ۲۰۰۴ء کے شمارے میں والد گرامی نے مسجد اقصیٰ کی تولیت کے ضمن میں میرے نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''عزیزم سلمہ نے ایک علمی و تحقیقی عنوان پر اپنے مطالعہ و تحقیق کا حاصل اس مضمون میں پیش کیا ہے۔ میں خود اس پر اپنے موقف اور بعض تحفظات کا اظہار اپنے تبصرہ میں کر چکا ہوں جو ''الشریعہ'' کے ایک گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، لیکن میں اسے اس عزیز کا بلکہ مطالعہ و تحقیق سے دل چسپی رکھنے والے ہر شخص کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج کو سامنے لائے اور اپنا موقف دلائل کے ساتھ پیش کرے اور اگر کسی کو اختلاف ہے تو وہ طعن و تشنیع کا سہارا لینے کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اختلاف کرے اور اس کا اختلاف بھی اسی طرح ''الشریعہ'' کے صفحات کی زینت بنے مگر مجھے افسوس ہے کہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ناظم اور ہمارے رفیق کار مولانا حافظ محمد یوسف کے سوا کسی اور اختلاف کرنے والے دوست نے اسے سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا موضوع نہیں بنایا جبکہ ہماری خواہش ہے کہ اہل علم آج کی دنیا کے ایک اہم بین الاقوامی تنازع کے اس علمی پہلو کو سنجیدگی سے لیں اور دلائل کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کریں کیونکہ علمی مباحثہ کے ساتھ ہی اس قسم کے مسائل میں اصل صورت حال تک رسائی ہوتی ہے۔''

دسمبر ۲۰۰۷ء میں میرا ایک مفصل مقالہ ''شریعت، مقاصد شریعت اور اجتہاد'' کے زیر عنوان ''الشریعہ'' میں شائع ہوا جس میں، میں نے مقاصد شریعت کی بنیاد پر منصوص احکام میں تبدیلی کے تصور کا تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے امور پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت واضح کی تھی جو روایتی طور پر طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ والد گرامی نے اس مضمون کی تمہید کے طور پر ایک تفصیلی شذرہ لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے زیر نظر مقالہ میں مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور انتہائی عرق ریزی اور نکتہ رسی کے ساتھ اس کے مختلف زاویوں کو اہل علم کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے مقالہ کے دونوں پہلوؤں سے اصولی طور پر اتفاق ہے کہ: ۱۔ مقاصد و مصالح کے معیارات تبدیل ہو جانے کی بنیاد پر قرآن و سنت کے صریح احکام میں تغیر و تبدل کا کوئی جواز نہیں ہے، اور ۲۔ جو امور اجتہاد کے دائرے میں آتے ہیں اور جن مسائل و معاملات میں احوال و زمانہ کے تغیرات کا مجتہدین کے ہاں ہمیشہ لحاظ رکھا جاتا رہا ہے، ان میں قطعی جمود کی موجودہ صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے بلکہ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت آج بھی موجود ہے جو زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ البتہ اس مقالہ کی تمام جزئیات اور ترجیحات سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور ہر علمی بحث و مباحثہ کی طرح اس کے مختلف پہلوؤں پر بھی مزید بحث، اختلاف اور نقد کی گنجایش موجود ہے۔''

۲۰۰۸ء میں ''حدود وتعزیرات: چند اہم مباحث'' کے نام سے میری ایک تصنیف المورد کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس میں حدود وتعزیرات سے متعلق شرعی احکام کی تعبیر وتشریح کے ضمن میں عصر حاضر کی اہم علمی بحثوں کا ایک طالب علمانہ مطالعہ پیش کیا گیا تھا۔ والد گرامی نے اس پر تفصیلی پیش لفظ لکھا جو الشریعہ کے اکتوبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں ''اسلامی شریعت کی تعبیر وتشریح۔ علمی وفکری سوالات'' کے عنوان سے کلمہ حق کے طور پر شائع ہوا۔ والد گرامی نے اس میں لکھا کہ:

''کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے علمی بحث ومباحثہ کا میدان محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی ماضی میں اہل علم کے ہاں اس کا دائرہ کبھی تنگ رہا ہے۔ ہماری علمی روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر بحث ومباحثہ ہمیشہ کھلے دل ودماغ سے کیا گیا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر بات ہوئی ہے، تجزیہ وتنقیح کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا اور استدلال واستنباط کی کوئی گنجایش ادھوری نہیں رہنے دی گئی، کیونکہ جس طرح کسی مقدمے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے تفتیش کے کسی امکانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کسی علمی مسئلے میں صحیح نتیجے تک رسائی کے لیے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو کھنگالنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے میں اہل علم میں بحث ومباحثہ کے لیے کھلے ماحول کو پسند کرتا ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔.....

آج کے نوجوان اہل علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابل قبول صورت نکل آئے، مگر انھیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت 'قدامت پرستی' اور 'تجدد پسندی' کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہل علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے اسی علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود وتعزیرات اور ان سے متعلقہ امور ومسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے، البتہ اس علمی کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہل علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، بحث ومباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر اظہار خیال کریں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں، اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے۔''

(حضرت شیخ الحدیث کی بیماری کے آخری ایام میں میری اس تصنیف کی شکایت حضرت کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس کے کچھ ''ایمان سوز'' اقتباسات بھی حضرت کو پڑھ کر سنائے گئے تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس موقع پر صرف میرے

اقتباسات سنانے پر اکتفا کی گئی ہو اور ''اصل بات'' حضرت کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو، یعنی یہ کہ آپ کے منتخب کردہ جانشین نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے اور صاحب کتاب کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کا اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔)

اس تحریر میں ''الشریعہ'' میں جگہ پانے والے جملہ مباحث کا استقصا ظاہر ہے کہ مقصود نہیں، تاہم مذکورہ جائزے سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ مختلف اور متنوع علمی سوالات اور فقہی واجتہادی موضوعات کو زیر بحث لانے اور اس پر کوئی بھی نقطہ خیال رکھنے والے اہل علم کو آزادی سے اپنا موقف پیش کرنے کی روایت کم از کم ان آٹھ نو سالوں میں ایک مستقل پالیسی اور معمول کے طور پر جاری تھی۔ چنانچہ یہ اعتراض بالکل بے سروپا ہے کہ یہ منہج حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کہنا بھی ایک دور از کار توجیہ کے مترادف ہوگا کہ یہ چیز حضرت شیخ کے سامنے اور ان کے علم میں نہیں تھی۔ اول تو جب تک ان کی صحت نے اجازت دی، وہ خود باقاعدہ الشریعہ کے قاری تھے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس عرصے میں شائع ہونے والے بہت سے مباحث براہ راست ان کی نظر میں تھے۔ شدید علالت کے زمانے میں وہ خود مطالعہ نہیں کر سکتے تھے، لیکن وہ اپنے پاس موجود خادمین سے اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ بالفرض وہ خود نہ بھی پڑھتے یا پڑھوا کر سنتے ہوں، پھر بھی اپنے خاندان میں، اپنی سرپرستی میں اور اپنے بیٹے اور جانشین کی زیر ادارت شائع ہونے والے مجلّے کے رجحانات اور مسائل ومباحث سے وہ کسی طرح بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ الشریعہ ان کے خاندان میں اور اردگرد کے ماحول میں ہر جگہ پڑھا جاتا تھا اور اس میں شائع ہونے والے بعض مباحث، مثلاً طلاق ثلاثہ سے متعلق مضامین پر تو کئی لوگ باقاعدہ شکایت لے کر ان کے پاس گئے تھے۔

یہ توجیہ بھی بدیہی طور پر بے کار ہوگی کہ وہ علالت کی وجہ سے اس معاملے میں کوئی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے، کیونکہ ان کا والد گرامی اور خاندان کے تمام قریبی افراد سے مسلسل رابطہ تھا اور وہ جملہ معاملات سے باخبر بھی رہتے تھے اور اپنی رائے بھی دیا کرتے تھے۔ اپنے آخری دنوں کی شدید علالت میں انھوں نے عم مکرم مولانا عبدالحق خان بشیر سے مولانا طارق جمیل کے بعض نظریات پر اپنی راہ نمائی میں تنقید لکھوائی تھی اور باقاعدہ سن کر اس کی تصویب کی تھی۔ غرض کوئی وجہ یا کوئی عذر ایسا نہیں تھا جو والد گرامی کے طرز فکر یا الشریعہ کی پالیسی کے معاملے میں انھیں رائے دینے یا والد گرامی کو طلب کر کے ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنے میں مانع ہو۔ اس کے باوجود انھوں نے والد گرامی کے اس رجحان پر کبھی ان کا مواخذہ نہیں کیا کہ وہ دور جدید کے علمی وفکری سوالات کے تناظر میں توسع سے کام لیتے ہوئے مختلف علمی حلقوں سے استفادہ کی ضرورت کے کیوں قائل ہیں یا ''الشریعہ'' کو آزادانہ علمی بحث ومباحثہ کا فورم کیوں بنا رکھا ہے یا آزاد فکری کی روش اختیار کرنے پر عمار کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کیوں کر رہے ہیں۔ الشریعہ کی پالیسی، والد گرامی کا انداز نظر اور الشریعہ میں زیر بحث آنے والے موضوعات، یہ سب چیزیں ان کے سامنے تھیں اور ان حقائق کے معلوم ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی علمی جانشینی کے لیے والد گرامی کا انتخاب کیا، انھیں مدرسہ نصرۃ العلوم میں اپنی

جگہ تدریس کے منصب پر بٹھایا اور اپنی نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت فرمائی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ شاید 'الشریعہ' میں زیر بحث آنے والے مسائل میں روایتی مذہبی حلقے کی نمائندگی کو کمزور محسوس کرتے تھے اور بات ان کے علمی وتحقیقی مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خود انھوں نے جن اختلافی مباحث پر اپنی تصانیف میں داد تحقیق دی ہے، ان میں کہیں بھی کسی سوال یا موقف سے نظریں چرانے یا قاری کو یک طرفہ معلومات ودلائل فراہم کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ ان کی تصانیف کے قاری جانتے ہیں کہ وہ مخالف کا موقف خود اس کے اپنے الفاظ میں اور بسا اوقات طویل اقتباسات کی صورت میں نقل کرتے ہیں اور پھر جواب میں ایک ایک شق پر تفصیلی گفتگو فرماتے ہیں۔ خاص طور پر ماحول میں موجود کسی بحث یا سوال کے حوالے سے، جو علمی ودینی طور پر جواب طلب ہو، انھوں نے کبھی وہ رویہ نہیں اپنایا جو اب ان کے منتسبین کے ہاں غالب دکھائی دیتا ہے، یعنی یہ کہ فلاں مسئلہ تو طے شدہ ہے اور سرے سے قابل بحث ہی نہیں، اس لیے اس پر گفتگو کرنے یا مخالف موقف کے دلائل کو علمی طور پر موضوع بحث بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ 'الشریعہ' میں اٹھائے جانے والے مباحث کے حوالے سے روایتی مذہبی حلقے کا ردعمل بنیادی طور پر یہی رہا ہے اور بحث میں مثبت طور پر شریک ہو کر علمی طور پر اپنے موقف کا وزن ثابت کرنے کے بجائے بالعموم یہی مطالبہ کیا گیا ہے کہ جب یہ مسائل ''ہمارے'' اکابر کے ہاں طے شدہ ہیں تو ان پر بحث ومباحثہ کی دعوت ہی کیوں دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رویے کے ساتھ علمی مباحث میں اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی اس علمی سطح کی نہیں ہو سکتی جس کی خواہش حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ رکھتے تھے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی اس فکرمندی کا تعلق 'الشریعہ' کی پالیسی سے نہیں، بلکہ روایتی مکتب فکر کی ترجمانی کرنے والوں کے طرز تحریر کی کمزوری سے تھا۔ 'الشریعہ' نے اگر قصداً اور جانب داری سے کام لیتے ہوئے بحث کے کسی فریق کے موقف کو کمزور دکھانے کی کوشش کی ہو تو اسے اس پر مورد الزام ٹھہرانا بجا ہوگا، لیکن اگر کمزوری بحث میں شریک ہونے والوں کے ہاں پائی جاتی ہو تو اس کی ذمہ داری، ظاہر ہے کہ 'الشریعہ' پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی طرف سے کسی بھی موقع پر 'الشریعہ' کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے یا مباحثہ ومکالمہ کے حوالے سے اپنی پالیسی تبدیل کرنے کا مشورہ یا ہدایت نہیں کی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد اپنا طرز عمل ''الشریعہ'' نے نہیں، بلکہ ان حضرات نے بدلا ہے جن کی آنکھیں، کھلنے کے لیے حضرت شیخ الحدیث کی آنکھ بند ہونے کی منتظر تھیں۔ والد گرامی کے طرز فکر سے اختلاف رکھنے والے حضرات کے لیے درست اخلاقی رویہ یہ ہے کہ وہ ان پر حضرت شیخ الحدیث کی وفات کے بعد ان کے منہج سے انحراف کا بے بنیاد اور حقائق کا منہ چڑانے والا الزام عائد کرنے کے بجائے حوصلے سے کام لیتے ہوئے یہ کہیں کہ حضرت شیخ الحدیث سے اپنے جانشین کا انتخاب کرنے میں سنگین غلطی بلکہ گناہ سرزد ہوا ہے جس کی اب ہم تلافی چاہتے ہیں۔ اگر وہ یہ بات کہیں تو اس کے لیے فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ کی شرعی بنیاد بھی انھیں مل جائے گی، لیکن اس کے لیے جو اخلاقی جرات اور علمی دیانت درکار ہے، کیا ناقدین اس کی کوئی معمولی سی جھلک بھی دکھائیں گے؟

حافظ محمد اسامہ مدنی*

مولانا راشدی کے نظریات اور ''الشریعہ'' کی پالیسی

چند اعتراضات کا جائزہ

ہمارے مخدوم اور محترم بزرگ جانشین امام اہل السنۃ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب زید مجدہم ایک جامع الصفات شخصیت ہیں جو متعدد وجوہ سے اپنے اقران میں ممتاز ہیں۔ خاص کر اسلام پر مغربی اعتراضات والزامات کا رد کرنے، جدید ذہن کے اشکالات کو حل کرنے، ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر جاندار تبصرہ کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر پر اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق کی برتری واضح کرنا آپ کا خاصہ ہے اور بہت سے دوستوں کے نزدیک اس سلسلے میں آپ کو اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔

یہ دنیا کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ کوئی بھی شخصیت کتنی ہی معروف اور مقبول کیوں نہ ہو، اس کے ناقدین بہر حال کچھ نہ کچھ تعداد میں ضرور موجود رہتے ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی کی شخصیت بھی گزشتہ کچھ عرصے سے مختلف قسم کے اعتراضات کی زد میں ہے۔ ان میں سے بعض اہم اعتراضات کا ہم درج ذیل سطور میں جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ذات رسالت پر تنقید اور توہین میں فرق

مولانا راشدی کے خلاف اٹھائے جانے والے تنقیدی طوفان میں ان کے اس جملے کو خوب زیر بحث لایا جا رہا ہے کہ ''مسلمان محبوب خداؐ کی ذات اقدس پر تنقید برداشت کر سکتے ہیں، مگر توہین نہیں''۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب رقمطراز ہیں:

> ''اب سے ڈیڑھ صدی قبل ایک ہندو دانشور پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں، جو لاہور سے شائع ہوئی تھی، قرآن کریم اور جناب نبی اکرمؐ کے بارے میں ایک سو سے زیادہ اعتراض کیے تھے، لیکن بات چونکہ اختلاف کے لہجے میں کسی حد تک دلیل کے ساتھ کی تھی، اس لیے علمائے کرام نے ان اعتراضات کے جوابات دلیل کے ساتھ دیے جن میں مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ سب سے پیش پیش تھے، لیکن اسی لاہور میں راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے توہین آمیز کتاب لکھی تو

*رفیق تحریر ماہنامہ ''نصرۃ العلوم'' گوجرانوالہ

اس کا جواب غازی علم الدین شہید نے دیا تھا اور یہ جواب غازی شہید کو ہی دینا چاہیے تھا۔ اسی طرح انگریز دانشور سر ولیم میور نے جناب نبی اکرم ؐ کے بارے میں اپنی کتاب میں کچھ اعتراضات کیے تو ان کا جواب سر سید احمد خان مرحوم نے کتاب کی صورت میں دیا، لیکن لندن سے سلمان رشدی کی کتاب شائع ہوئی جس میں جناب نبی اکرم ؐ اور صحابہ کرامؓ کا مذاق اڑایا گیا ہے تو اس پر دنیا بھر کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے''۔

مولانا راشدی مزید فرماتے ہیں کہ:

''جہاں تک اختلاف اور تنقید کا تعلق ہے، اس کو مسلمانوں سے زیادہ کس نے برداشت کیا ہے؟ ..... مغرب کے مستشرقین صدیوں سے اسلام، قرآن کریم، جناب نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کی تہذیب و کلچر کے خلاف مسلسل لکھتے آ رہے ہیں اور مغرب کی یونیورسٹیوں کی لائبریریاں اس قسم کی کتابوں اور مقالات سے بھری پڑی ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ان کا جواب مقالات اور کتابوں کی صورت میں دلائل کے ساتھ دیا ہے اور اب بھی دلیل اور متانت کے ساتھ کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دلیل اور متانت کے ساتھ ہی دیا جا رہا ہے، لیکن تمسخر و استہزاء اور توہین و تحقیر کو کسی دور میں بھی برداشت نہیں کیا گیا، وہ آج بھی برداشت نہیں ہے اور آئندہ بھی کبھی برداشت نہیں ہوگا۔ جن دنوں سلمان رشدی کی توہین آمیز کتاب کے خلاف دنیا بھر میں احتجاج جاری تھا برمنگھم (برطانیہ) میں اس سلسلہ میں ہونے والے ایک جلسہ میں میری تقریر کے دوران ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ علمائے کرام اس کتاب کا جواب کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے عرض کیا بیٹا جواب دلیل کا ہوتا ہے، گالی کا نہیں، اگر کوئی شخص مجھے گالی دیتا ہے یا سر عام میری تحقیر اور توہین کرتا ہے تو میں اس کا جواب دینے کے لیے کسی لائبریری کا رخ نہیں کروں گا، بلکہ جو چیز میرے ہاتھ میں ہوگی، اس کے منہ پر دے ماروں گا۔ مغرب کا میڈیا، بلکہ دانش بھی اختلاف اور توہین میں فرق نہیں کر رہی اور تنقید اور تمسخر کو ایک ہی دائرے میں شمار کر رہی ہے۔ اس رویے کو میں خود اپنی ذات کے بارے میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں تو اپنے آقا و مولا حضرت رسول اکرم ؐ کے بارے میں کیسے برداشت کر لوں گا؟'' (نوائے قلم، روزنامہ پاکستان لاہور ۲۸ ستمبر ۲۰۱۲ء)

ان اقتباسات میں کوئی ایسی بات نہیں کی گئی جو اسلامی مسلمات کے منافی یا اکابر علمائے اسلام کے موقف کے خلاف ہو۔ بانی دار العلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مصنف اظہار الحق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ان جیسے دیگر کئی مسلم مناظرین غیر مسلم، ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے مناظروں میں اسلام، قرآن اور صاحب قرآن ؐ پر اعتراضات اور تنقیدات کو برداشت کرتے رہے ہیں۔ اگر تنقید اور توہین میں کوئی فرق نہیں تو غیر مسلموں سے مناظروں کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟ پھر تو غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین قتل کے مستحق گردانے جانے چاہییں، لیکن ہماری نظر سے ایسا کوئی فتویٰ نہیں گزرا جس میں غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین سے متعلق قتل کی بات کی گئی ہو۔ کیا ہمارے اکابر اپنے فرائض منصبی سے اتنے بے خبر اور اتنے بے حس تھے کہ غیر مسلم مناظرین اور مستشرقین، رسول خدا

کی توہین کرتے رہے اور یہ حضرات برداشت کر کے صرف جواب دینے پر اکتفا کرتے رہے؟

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تصنیف لطیف ''اسلام کا اخلاقی نظام'' جو ایک عیسائی پادری ڈاکٹر اودے مسیح (Udai Masih) کے خط کے جواب میں لکھی گئی ہے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ؐ پر تنقید کا جواب حضرت قاری صاحبؒ نے بڑے مدلل اور اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں دیا ہے اور یہ بھی کہ عیسائی پادری کو توہین رسالت ؐ کا ملزم گردان کر قتل کا فتویٰ نہیں صادر فرمایا بلکہ کتاب کے ابتدائیہ میں اس کا پورے کا پورا خط من وعن درج کر دیا ہے۔ جوابی خط کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ''مکرم بندہ جناب ڈاکٹر صاحب زید لطفکم''۔ توہین رسالت کے مرتکب کے لیے قاری صاحبؒ اتنی تکریم کیسے گوارا کر گئے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الاسلامؒ کے نزدیک بھی توہین اور تنقید میں فرق موجود ہے۔

اس سلسلہ میں تقریباً سال ڈیڑھ سال قبل ہم نے براہ راست مولانا زاہد الراشدی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

> ''ہم تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تنقید کو جائز نہیں سمجھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ لیکن اس سے غیر مسلم معترضین اور ناقدین کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ تو تنقید کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کے اعتراضات یا تنقیدات کو توہین کا نام دے کر ان سے منہ ہی موڑ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو سوالات یا اعتراضات کرتے ہیں، ان کا جواب تو دینا چاہیے نہ کہ ''توہین ہے، توہین ہے'' کہہ کر چپ سادھ لینی چاہیے۔ ہم تو مانتے ہیں کہ حضور ؐ تنقید سے بالا ہیں، لیکن اتنا کہہ دینے سے ناقدین کے منہ بند نہیں ہونے والے۔ ہم نے تو دنیا کے سامنے رسول اللہ ؐ کو بے عیب جیسا کہ وہ ہیں، اسی انداز میں پیش کرنا ہے۔ ہاں! اس کے بعد اگر کوئی توہین کا راستہ اختیار کرے تو معاملہ بدل جاتا ہے''۔

ممکن ہے کہ راقم مولانا راشدی کی بات کو حرف بہ حرف نقل نہ کر سکا ہو، بہر حال مولانا راشدی کی بات کا مفہوم بالکل یہی تھا۔ ایک اور مجلس میں مولانا راشدی سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ:

> ''میں عام طور پر اس حوالہ سے اختلاف کا لفظ استعمال کیا کرتا ہوں۔ ممکن ہے کسی موقع پر تنقید کا لفظ کہہ دیا ہو، مگر اس سے میری مراد اختلاف ہی ہوتا ہے۔ تنقید کو اختلاف کے معنی میں لیا جائے تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے، البتہ اگر کچھ لوگ تنقید اور توہین کو مترادف سمجھتے ہیں تو بات اور ہے، لیکن ہمارے ہاں اکابر اہل علم کی آراء پر جو ''علمی نقد'' کیا جاتا ہے، وہ تنقید ہی ہوتی ہے اور اہل علم کے ہاں اسے کبھی توہین پر محمول نہیں کیا گیا''۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر جب بعض دوستوں نے مختلف مدارس سے مولانا راشدی کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کی مہم چلائی تو بیشتر مفتیان کرام نے مولانا راشدی سے براہ راست تعارف رکھتے ہوئے کبھی خود ان سے ان کا موقف دریافت کرنے کی زحمت نہیں فرمائی، البتہ جامعہ دارالعلوم کراچی اور جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور کے مفتیان کرام نے اس اخلاقی بلکہ شرعی ذمہ داری کو محسوس کیا اور خود مولانا راشدی سے بات کر کے ان سے ان

کے موقف کی وضاحت طلب کی اور انہوں نے وہی وضاحت کی جو سطور بالا میں مذکور ہے۔

''قادیانیت نوازی'' کا بہتان

علامہ راشدی صاحب پر ایک اعتراض یہ گزشتہ کافی عرصے سے اٹھایا جا رہا ہے کہ انھوں نے پسرور کے ایک قادیانی مصنف قاضی عطاء کے اردو منظوم ترجمہ قرآن ''مفہوم القرآن'' پر تقریظ لکھ کر ''قادیانیت نوازی'' کا ثبوت دیا ہے۔ جن صاحب کو قادیانی بتایا گیا ہے، ان سے متعلق ذیل میں مفکر اسلام علامہ راشدی کا ایک خط من وعن شائع کیا جا رہا ہے، جو بعض اصحاب علم کے استفسار پر انہوں نے اس اعتراض کے جواب میں اور حقائق کو کھولنے کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط ماہنامہ نصرت العلوم دسمبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے اور ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے جو سنی سنائی بات کے سہارے کفر کا فتوی لگانے دریغ نہیں کرتے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

''باسمہ تعالیٰ

محترمی حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب وحضرت مولانا سید عبد المالک شاہ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

آپ دونوں بزرگوں نے قاضی عطاء اللہ صاحب پسروری کے بارے میں ایک استفسار میرے سپرد کیا تھا کہ میں اس کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ چونکہ قاضی صاحب کے منظوم ترجمہ قرآن ''مفہوم القرآن'' پر اعتراضات کے حوالہ سے اس پر میری تقریظ بھی موضوع بحث ہے، اس لیے میں اس کے بارے میں اب تک کی صورت حال اور اپنا موقف آپ کی خدمت میں تحریری طور پر پیش کر رہا ہوں۔

قاضی عطاء اللہ صاحب سے میرا کوئی پیشگی تعارف نہیں تھا، انہوں نے جب اس منظوم ترجمہ کی پہلی جلد شائع کی تو میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اس کے بارے میں کچھ تحریر کر دوں۔ میں نے وہ کتاب لے کر رکھ لی اور لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ اس قسم کے معاملات میں میرا ہمیشہ سے معمول یہ رہا ہے کہ اگر خود میرا تعارف نہ ہو تو مقامی علماء کرام سے رابطہ کرتا ہوں اور ان کے مشورہ کی روشنی میں قدم اٹھاتا ہوں۔ اس وقت حضرت مولانا رشید احمد پسروریؒ زندہ تھے۔ ایک موقع پر میں نے ان سے ملاقات کے موقع پر دریافت کیا تو انہیں نے اطمینان کا اظہار کیا کہ قاضی عطاء اللہ صاحب صحیح العقیدہ مسلمان ہیں، چنانچہ اس تصدیق کے بعد میں نے دو چار مقامات سے اس منظوم ترجمہ کو دیکھ کر وہ تقریظ لکھ دی جو اس میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد مجھے توجہ دلائی گئی کہ یہ قاضی صاحب موصوف مبینہ طور پر قادیانی ہیں اور اپنے ترجمہ میں بھی انہوں نے قادیانی تحریفات کا راستہ اختیار کیا ہے، اس لیے مجھے اپنی تقریظ سے دست برداری اختیار کر لینی چاہیے۔ اس پر میں نے یہ عرض کیا کہ جو اعتراضات ہیں، وہ تحریری صورت میں دیے جائیں۔ اگر درست ہوئے تو مجھے اپنی تحریر واپس لینے میں کوئی تأمل نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پسرور کے

علماء کرام سے دوبارہ رابطہ قائم کیا بلکہ خود پسرور گیا اور مختلف علماء کرام سے اس بارے میں دریافت کیا اور ان کی طرف سے یہی جواب ملا کہ قاضی عطاء اللہ صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ قادیانی ہیں، درست نہیں ہے جبکہ ان کے بارے میں تحریری اعتراضات میں نے برادرم مولانا مشتاق احمد چنیوٹی کے سپرد کیے کہ وہ ان پر تبصرہ تحریر فرمائیں، مگر انہوں نے جو تبصرہ تحریر فرمایا مجھے اس سے اطمینان حاصل نہ ہوا اور میں نے خود مولانا مشتاق احمد صاحب سے عرض کیا کہ میں ان کی تحریر سے مطمئن نہیں ہوں، اس لیے کہ ان کے تبصرہ کی بنیاد محتملات پر ہے اور کسی شخص کو قادیانی قرار دینے یا اس پر کفر کا فتویٰ عائد کرنے کے لیے محتملات کافی نہیں ہوتے، اس کے لیے تصریحات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس دوران جماعت ''الدعوۃ'' پاکستان کے ترجمان ہفت روزہ ''غزوہ'' لاہور میں یکم تا ۷ دسمبر ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ قاضی عطاء اللہ نامی ایک قادیانی شخص پسرور میں قرآن کریم کا تحریف شدہ ترجمہ تقسیم کر رہا ہے جس کے بعد اسی ہفت روزہ ''غزوہ'' کے ۷ تا ۱۳ دسمبر ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

> ''مفہوم القرآن (منظوم) اردو کے مصنف عطا قاضی اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ غزوہ کے دفتر میں آئے اور قادیانیت سے علی الاعلان برأت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کرتا ہوں۔ مرزا قادیانی کو کذاب مانتا ہوں، ختم نبوت پر مکمل یقین رکھتا ہوں، مرزا غلام احمد کو نہ نبی مانتا ہوں اور نہ مجدد تسلیم کرتا ہوں''۔

اس کے بعد قاضی عطاء اللہ مذکور نے اپنے لیٹر پیڈ پر ایک تحریر لکھ کر پسرور کے علماء کرام کے سامنے پیش کی جس میں یہ درج ہے کہ:

> ''خدا تعالیٰ کی وحدانیت، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ان کی ختم نبوت پر دل و جان سے کامل ایمان رکھتا ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ظلی اور بروزی نبی کو مفتری اور کذاب جانتا ہوں اور مانتا ہوں اور میرا مرزا غلام احمد قادیانی سے اور اس کی قادیانی جماعت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔''

اس تحریر پر ان کے مسلمان ہونے کی پسرور کے جن علماء کرام نے تحریری تصدیق کی ہے ان میں حضرت مولانا رشید احمد پسروریؒ کے دونوں صاحبزادے مولانا بلال احمد اور مولانا مفتی محمد نعمان کے علاوہ مولانا حافظ محمد سرور، جمعیۃ علماء اسلام ضلع سیالکوٹ کے امیر مولانا قاری غلام فرید اعوان، جامعہ اسلامیہ پسرور کے مہتمم مولانا محمد شفیق، جامعہ نعیمیہ رضویہ پسرور کے شعبہ افتاء کے انچارج مولانا جمیل احمد ہدایتی پسروری اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ضلع سیالکوٹ کے ناظم حافظ کفایت اللہ شاکر شامل ہیں، یہ سب تحریریں میں نے خود دیکھی ہیں اور میرے پاس ان کی فوٹو کاپی موجود ہے۔

اس کے ساتھ ہی قاضی عطاء اللہ مذکور نے حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے عقیدہ کی وضاحت

اپنے لیٹر پیڈ پر تحریر کی ہے جو تفسیر مظہری کے حوالہ سے ہے اور اس میں ''آیت کریمہ'' ''انی متوفیک'' کے حوالہ سے مفسرین کرامؒ کے مختلف اقوال کا تذکرہ کر کے ان کا محاکمہ کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس جملہ پر ہوتا ہے کہ:

> ''لہٰذا توفی سے مراد بغیر موت آسمان پر اٹھا لینا ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے کہ وما قتلوہ وما صلبوہ، نہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کیا اور نہ صلیب دی۔ وجدان شاہد ہے کہ اگر اٹھائے جانے سے پہلے عیسیٰؑ کی موت کی نفی تسلیم نہ کی جائے تو نفی قتل کی صراحت کا کیا فائدہ؟ قتل کا نتیجہ بھی تو موت ہی ہے۔''

ان تصریحات کے بعد پورے شرح صدر اور اطمینان کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قاضی عطاء اللہ مذکور یا ان کے بیٹوں کو جو تمام معاملات میں اپنے باپ کے ساتھ ہیں، قادیانی قرار دینا اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کرنا شرعاً یا اخلاقاً کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور اگر ان کی تحریر میں کوئی جملہ اس سے ہٹ کر کسی دوسرے معنیٰ کا احتمال بھی رکھتا ہے تو اسے اس صراحت اور اقرار کی روشنی میں اسی معنیٰ پر محمول کیا جانا چاہیے، البتہ ان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ابہام کو اس کتاب میں ہی دور کر دیں اور اگلے ایڈیشن میں اس کی وضاحت کر دیں۔ اس استفتاء کے حوالہ سے آپ دونوں بزرگوں کی تشویش کی وجہ سے میں اس کے بعد دوبارہ ۱۸ نومبر ۲۰۰۷ء کو خود پسرور گیا ہوں اور وہاں کے بعض علماء کرام سے از سر نو اس مسئلہ پر بات کی ہے اور انہیں اپنے سابقہ موقف پر مطمئن پایا ہے، اس لیے میں قاضی عطاء اللہ پسروری کے منظوم ترجمۂ قرآن کریم ''مفہوم القرآن'' پر لکھی گئی اپنی تقریظ پر قائم ہوں اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

شکریہ والسلام

ابو عمار زاہد الراشدی

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۱۹/۱۱/۲۰۰۷ء،،

ماہنامہ الشریعہ ستمبر ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں مفکر اسلام علامہ راشدی نے ''دینی جدوجہد اور اس کی اخلاقیات'' کے عنوان سے اپنی طرف منسوب ''قادیانیت نوازی'' کی داستان پیش کی، اس مضمون کے دو اقتباس بھی ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

> ''بعض دوستوں کی طرف سے اعتراض ہو کہ میں نے ایک قادیانی کی تفسیر قرآن کریم پر تقریظ لکھ دی ہے۔ صرف اعتراض نہیں ہوا بلکہ ملک بھر میں اس کی خوب تشہیر کی گئی، چنانچہ مختلف شہروں سے مجھے فون آنے لگے، بلکہ عام حلقوں میں تقسیم کیے جانے والے ایک پمفلٹ میں اس اعتراض کا ذکر کیا گیا جس پر میں نے قاضی عطاء اللہ موصوف سے رابطہ کیا تو وہ ایک بڑی فائل لے کر میرے پاس آ گئے جو ان کے قادیانی ہونے

کے اخباری پراپیگنڈا اور ان کی طرف سے جوابات پر مشتمل تھی اور ان کا ایک حلف نامہ بھی اس میں شامل تھا جس میں پوری وضاحت سے کہا گیا ہے کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں اور قادیانی نہیں ہیں۔ اس حلف نامہ میں انہوں نے اپنے عقائد کا بھی دوٹوک انداز میں ذکر کیا ہے اور اس پر پسرور کے دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث مکاتب فکر کے معروف علماء کرام کی تصدیقات ہیں۔ اس کے بعد ایک موقع پر میں پسرور گیا تو مختلف علماء کرام سے براہ راست بھی اس مسئلہ پر بات کی۔ انھوں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا کہ قاضی صاحب موصوف پر قادیانی ہونے کا الزام غلط ہے اور وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود نہ صرف پراپیگنڈا مہم جاری رہی بلکہ مسلسل لابنگ بھی ہوتی رہی، چنانچہ ہمارے اپنے مدرسہ جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ کے دو بزرگ اساتذہ حضرت مولانا سید عبدالمالک شاہ صاحب اور حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس کی تحریری وضاحت طلب کی اور تقاضا کیا کہ میں قاضی عطاء اللہ موصوف کی کتاب ''مفہوم القرآن'' پر اپنی تقریظ سے رجوع کا اعلان کروں۔ اس پر میں نے ایک مرتبہ پھر پسرور کے علماء کرام سے رابطہ کیا مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ پا کر تقریظ واپس لینے سے معذرت کر دی اور دونوں بزرگوں کو تحریری طور پر اصل صورت حال اور اپنے موقف سے آگاہ کر دیا۔''

علامہ راشدی مزید فرماتے ہیں:

''پاکستان شریعت کونسل میں میرے قریب کے ساتھیوں سے رابطہ کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ مجھے اپنے موقف پر نظر ثانی کے لیے کہیں۔ مولانا عبدالحق خان بشیر میرے حقیقی بھائی ہیں اور پنجاب شریعت کونسل کے امیر ہیں جبکہ لاہور باغبان پورہ کے مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر میرے حقیقی بھائیوں کی طرح ہیں اور مرکزی شریعت کونسل کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل ہیں۔ دونوں حضرات میرے پاس الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں تشریف لائے اور اس مسئلے پر مجھ سے تفصیلی بات کی۔ میں نے گزارش کی کہ مجھے اپنے موقف پر اس قدر اصرار نہیں ہے کہ اس پر کسی کی بات نہ سنوں۔ آپ دونوں حضرات خود پسرور تشریف لے جائیں اور اپنے طور پر وہاں کے علماء کرام سے بات کر کے تحقیق کریں۔ اس کے بعد آپ دونوں حضرات جو بھی کہیں گے، میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات پسرور تشریف لے گئے اور اپنے طور پر صورت حال معلوم کی۔ واپسی پر انہوں نے جو رپورٹ پیش کی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی عطاء اللہ صاحب کو قادیانی قرار دینے کی بات تو درست نہیں ہے، البتہ ان کی اس کتاب کے بعض مندرجات پر اشکالات ہیں اور ان سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ان عبارات سے قادیانیوں کی بعض باتوں کی حمایت کا تاثر ملتا ہے۔ ان کی اگر وضاحت ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

اس حوالے سے قاضی صاحب سے میری بات اس سے قبل بھی ہو چکی تھی اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ عالم دین نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے قرآن کریم کا ازسرنو کوئی ترجمہ کیا ہے، بلکہ انہوں نے اردو

تراجم کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کے اردو ترجمہ کو منظوم شکل دی ہے، اس لیے علماء کرام جہاں بھی کوئی اشکال محسوس کریں، اس کی نشاندہی کر دیں، میں اس عبارت کی اصلاح کر دوں گا، مگر مولانا عبدالحق خان بشیر اور مولانا قاری جمیل الرحمان اختر کی پسرور سے واپسی کے بعد میں نے دوبارہ قاضی عطاء اللہ صاحب سے رابطہ کیا اور وہ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کا موقف اب بھی وہی تھا کہ علماء کرام کتاب کا مطالعہ کر کے نشاندہی کریں۔ جو عبارت بھی مشتبہ ہوگی، وہ اسے تبدیل کر دیں گے۔ چنانچہ اب وہ کتاب میں نے نظر ثانی اور تفصیلی مطالعہ کے لیے مولانا عبدالحق خان بشیر کو دے دی ہے اور ان کی ابتدائی رپورٹ یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی واضح عبارت تو نظر نہیں آئی، البتہ بعض عبارات سے اشتباہ ہوتا ہے جن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔''

رافضیت نوازی کا الزام

''رافضیت نوازی'' کے ضمن میں وہ علامہ راشدی کی اس عبارت کو بھی زیر بحث لایا جا رہا ہے کہ:

''(اسلام) اسلامی سوسائٹی کے ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کیلئے آواز اٹھائے، حکمرانوں اور مقتدر طبقات پر تنقید کرے اور سوسائٹی کے مفاد کیلئے ہر سطح پر مشورہ دے۔ اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجہ میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۰۸ء)

مندرجہ بالا عبارت کے خط کشیدہ الفاظ سے انتہائی حیرت انگیز طور پر یہ مطلب اخذ کیا گیا ہے کہ علامہ راشدی خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کو حجت شرعیہ نہیں تسلیم کرتے۔ اس مقام پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کی آرا اور فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہونا ایک اور چیز ہے اور ان کے اجتماعی فیصلوں کا حجت شرعیہ ہونا ایک بالکل الگ چیز ہے، اور ان دونوں باتوں کو گڈمڈ کر کے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرنا شدید بددیانتی کا مظہر ہے۔

بلاشبہ خلفائے راشدینؓ کے فیصلے حجت شرعیہ ہیں اور اس بارے میں مفکر اسلام حضرت علامہ راشدی رقمطراز ہیں کہ

''صحابہ کرامؓ کے اقوال کے دائرے میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا ایک ایسا اصول ہے جو نہ صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کی ایک اہم اساس ہے، بلکہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں ''الجماعۃ'' کا لفظ بھی اسی کی غمازی کرتا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر زمانہ میں نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی گنجائش ہے اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ماضی کے اجتہادات اور علمی تسلسل بالخصوص حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماعی فیصلوں اور رجحانات کی نفی نہ ہو، بلکہ نیا استدلال واستنباط ماضی کے علمی تسلسل میں اضافہ اور اس کے ارتقاء کا باعث بنے۔'' (ماہنامہ الشریعہ، مئی جون ۲۰۰۹ء)

ایک اور مقام پر مختلف دلائل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہؓ اور حضرت امام شافعیؒ کے ان ارشادات کی روشنی میں کسی معاملے کو طے کرتے وقت ترجیحات کی ترتیب یوں ہوگی۔

۱۔ کتاب اللہ، ۲۔ سنت نبویؐ، ۳۔ خلفائے راشدینؓ کے فیصلے، ۴۔ اجماع امت، ۵۔ صلحاء امت کے فیصلے

تو اب بات یوں طے ہوئی کہ جن امور میں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت نبویؐ (۳) خلافت راشدہ (۴) اجماع امت اور (۵) علماء امت کا کوئی واضح فیصلہ سامنے آ چکا ہے، وہ طے شدہ امور ہیں، ان میں ترمیم و تبدل یا جدید اصطلاح میں قانون سازی کی گنجائش نہیں ہے''۔ (اسلام، جمہوریت اور پاکستان صفحہ ۵۶)

مولانا راشدی کی جس عبارت پر اعتراض کیا گیا ہے، اس سے متعلق ایک ساتھی نے براہ راست ان سے استفسار کیا تو انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریری طور پر اس کا جواب عنایت فرمایا جو موقع کی مناسبت سے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

''حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلے بلاشبہ حجت ہیں، لیکن کیا خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش نہیں تھی اور کیا اس دور میں ان کے فیصلوں سے اختلاف نہیں کیا گیا؟ مثلاً:

۱۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے بیت المال سے وظائف کی تقسیم میں مساوات کا اصول اختیار کیا تھا مگر حضرت عمرؓ نے ان کے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے درجہ بندی کا اصول اختیار کیا اور پورا نظام تبدیل کر دیا۔

۲۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے حج تمتع سے منع کر دیا تھا جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کا اس سے کھلا اختلاف احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہے اور آج بھی حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اس موقف پر عمل نہیں ہو رہا۔

۳۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جنبی کے لیے تیمّم کی اجازت نہیں دیتے تھے جبکہ جمہور صحابہؓ نے اس سے اختلاف کیا اور آج بھی اس فتویٰ پر عمل نہیں ہو رہا۔

۴۔ حضرت عمرؓ کے دور میں شرابی کے لیے اسی ۸۰ کوڑے کی سزا مقرر کرنے کا باہمی مشاورت کے ساتھ فیصلہ ہوا مگر حضرت علیؓ نے اس کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا جو صحیح احادیث میں موجود ہے۔

۵۔ خلفائے راشدینؓ کے متعدد انتظامی فیصلوں اور احکام سے عام صحابہؓ نے اختلاف کیا اور اس کا کھلم کھلا اظہار کیا جن پر بعض فیصلوں سے انہیں رجوع بھی کرنا پڑا۔

۶۔ رائے کا اختلاف تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تسلیم کیا ہے جس کی واضح مثال غزوۂ احد میں اپنی رائے کے خلاف عام صحابہ کرامؓ کی رائے کو قبول کرنا ہے۔

۷۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی حیثیت مجتہد کی تھی، امام معصوم کی نہیں تھی جس کے فیصلوں میں خطا کا احتمال نہ ہو اور ان کا ہر فیصلہ امت کے لیے ہر حال میں تسلیم کرنا واجب ہو۔

۸۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ

ان استقمت فا عینونی و ان انا زغت فقومونی

اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔

کیا یہ عام لوگوں کا رائے اور اختلاف کا حق تسلیم کرنے کا اعلان نہیں تھا؟

اس لیے صحابہ کرامؓ کے اجتماعی تعامل اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں کا حجت ہونا اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اس سے اختلاف کے حق کی نفی نہیں ہوتی اور دونوں باتوں کو خلط ملط کر کے اس سے اپنی مرضی کا نتیجہ نکالنے کی کوشش کرنا صحیح طرز عمل نہیں ہے جبکہ حضرت امام اعظمؒ کے ارشاد گرامی کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدینؓ کے باہمی اختلاف کے دائرے کو تسلیم کرتے ہیں البتہ جس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا باہمی اختلاف موجود ہے اس میں ان کے اقوال کے دائرے سے باہر نکل کر الگ قول اختیار کرنے کو پسند نہیں کرتے اور یہ بات اختلافات کی نفی کرنے کے بجائے انہیں تسلیم کرنے پر مبنی ہے۔''

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ عبارت (صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے) ''رافضیت نوازی'' کے ضمن میں کیوں زیر بحث لائے ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ عبارت اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان حد فاصل اور اہل تشیع کے ''نظریہ امامت'' کی زبردست تردید پر مبنی ہے۔ علامہ راشدی صاحب اس کی وضاحت میں ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''(اہل سنت اور اہل تشیع کے بنیادی اختلافات میں) چوتھا فرق یہ ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا براہ راست نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ''معصوم عن الخطاء'' ہے اور اس کی کسی بات کو خطا سے موسوم نہیں کیا جا سکتا جبکہ خلیفہ معصوم نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی درجہ مجتہد کا ہے اور مجتہد کے فیصلوں میں صواب اور خطاء دونوں کا احتمال یکساں قائم رہتا ہے۔ ہمارا اہل سنت کا اصول ہے کہ ''المجتهد يخطى ويصيب'' مجتہد خطا کا مرتکب بھی ہوتا ہے اور صواب کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اس لئے مجتہد کی کسی بھی بات سے علمی دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا اور خلفاء راشدینؓ اور ائمہ مجتہدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے، مگر ''امام'' معصوم اور اس کی رائے میں خطا کا احتمال نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں بزرگوں کے خلیفہ کی حیثیت سے یہ پہلے خطبوں میں صراحت موجود ہے کہ ہم قرآن وسنت کے مطابق حکومت کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ تم پر ہماری اطاعت ضروری ہے۔ اگر ہم قرآن وسنت کے پابند رہیں تو ہمارا ساتھ دو اور اگر ہم قرآن وسنت سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں تو ہماری اطاعت تم پر ضروری نہیں ہے''۔ (ماہنامہ نصرت العلوم، مئی ۲۰۱۱ء)

قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ''رافضیت نوازی'' اور ''شیعیت نوازی'' کا یہ الزام مشائخ نصرۃ العلوم بالخصوص بانی جامعہؒ پر بھی بہت پرانا ہے۔ ایک جذباتی شخص نے جامعہ نصرت العلوم میں موجود مفسر اعظم قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان صاحب سواتی نور اللہ مرقدہ کی مشہور زمانہ تفسیر ''معالم العرفان فی دروس القرآن''، ''دروس

الحدیث'' اور ''خطبات سواتی'' وغیرہ کتب پر مشتمل گودام کو صرف اس وجہ سے آگ لگا دی تھی کہ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنے دروس وخطبات میں اہل تشیع کو اگرچہ گمراہ کن مگر مسلمانوں کا باقاعدہ ایک فرقہ تسلیم کیا ہے اور بحیثیت مجموعی وہ علی الاطلاق تکفیر شیعہ کے بھی قائل نہیں تھے بلکہ ضروریات دین کا انکار کرنے والوں کے بارے میں شخصی یا ذیلی گروہ کے حوالے سے تکفیر کے قائل تھے اور اسی بنا پر وہ مشترکہ ملی وقومی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت کے حق میں تھے۔ مفکر اسلام علامہ راشدی پر ''رافضیت نوازی'' کا یہ الزام بھی مفسر قرآنؒ کے اسی نظریہ سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے لگایا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ تکفیر شیعہ سے متعلق یہ نظریہ حضرت مفسر اعظم قرآنؒ کے تفردات میں سے نہیں ہے بلکہ محقق اہل علم اور معتمد مفتیان کرام اور اکابر علماء دیوبند کی ایک اچھی خاصی تعداد بلکہ عملاً جمہور اہل السنۃ والجماعۃ علماء دیوبند اسی نظریہ پر کاربند ہیں، مثلاً تعلیمی میدان میں اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ کا اسٹیج، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا اسٹیج، اور جمعیۃ علماء اسلام کے قومی وملی اتحادات کے اسٹیج اور مسلم پرسنل لاء بورڈ وغیرہ اور اگر اسی بنیاد پر ''رافضیت نوازی'' کے سرٹیفکیٹ جاری کرنیکی مہم شروع کر دی جائے تو معلوم نہیں اس کی زد میں کون کون آئے گا۔ سوچ بچار (جس کا بے حد فقدان ہے) کر کے انہیں اس کے ممکنہ نتائج پر بھی ایک نظر کر لینی چاہیے۔

مولانا مودودیؒ کے ''تفردات'' کے حوالے سے موقف

علامہ زاہد الراشدی صاحب نے مولانا معین الدین خٹکؒ کے مجموعہ افادات ''معین القاری شرح صحیح البخاری'' سے متعلق ایک تحریر لکھی ہے جو مذکورہ کتاب کی پہلی جلد کے آغاز میں شامل کی گئی ہے۔ ناقدین کے نزدیک یہ بات بھی قابل اعتراض ہے، جبکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اکابر علماء دیوبند کے طرز عمل کی روشنی میں دیگر مسالک کے مصنفین کی کتابوں پر ''رائے''، ''تقریظ'' اور ''تائیدی تبصرہ'' وغیرہ تحریر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اکابر کی روایات کا تسلسل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ تقریظ، تبصرہ اور رائے لکھنے والے نے دوسرا مسلک بھی اختیار کر لیا ہے یا اس کی بالکلیہ تائید وتصویب کر دی ہے۔ یہ تو بعض مخصوص عنوانات میں ان کی قلمی، تحقیقی، ادبی، تاریخی، سیاسی، قومی اور ملی خدمات کا اعتراف ہوتا ہے۔ اس کتاب پر بھی مولانا راشدی کی جو ''رائے'' درج ہے، اس میں مودودی صاحب کے حوالے سے ان کے شاگردوں کے دفاعی طرز عمل پر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر فکری نقد بھی کیا گیا ہے۔ مولانا راشدی لکھتے ہیں:

> ''مولانا معین الدین خٹکؒ کا تعلق کرک ضلع کوہاٹ سے تھا، انہوں نے دورہ حدیث مدرسہ شاہی مراد آباد (انڈیا) میں حضرت مولانا فخر الدینؒ سے کیا اور پھر پوری زندگی درس وتدریس میں گزار دی۔ وہ ان علمائے کرام میں سے تھے جنہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرف سے دینی عقائد واحکام کی تعبیرات وتشریحات میں بعض تفردات سامنے آنے پر ان سے اختلاف کرنے والے جمہور علماء کا ساتھ دینے کے بجائے ان تفردات کے دفاع کا راستہ اختیار کیا اور آخر وقت تک اس موقف پر قائم رہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں اگر مولانا

مودودیؒ کے تفردات کو بھی دوسرے اہل علم کی طرح تفردات ہی کے درجے میں رہنے دیا جاتا اور انہیں مستقل موقف کی حیثیت دے کر ان کے اثبات و دفاع میں اس درجہ شدت اختیار نہ کی جاتی تو اس معاملہ میں بہت سے بگاڑ سے بچا جا سکتا تھا''۔

اس عبارت کے حوالہ سے یہ کہا گیا ہے کہ مولانا راشدی مودودی صاحب کے نظریات کو ''اہل علم کے تفردات'' میں شامل کر کے امام اہل سنتؒ اور جملہ اکابر علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی مساعی جمیلہ پر پانی پھیر رہے ہیں۔ حالانکہ مولانا راشدی نے اپنا مؤقف برملا جمہور علماء کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ان کی عبارت میں دو باتیں بڑی واضح ہیں:

(۱) مودودی صاحب کو دینی عقائد و احکام کی تعبیرات و تشریحات میں جمہور علماء کے مؤقف سے علیحدہ شمار کیا ہے۔

(۲) مولانا مودودی کے دفاع میں ان کے شاگردوں نے ہر حال میں انہیں برحق ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا، اسے بگاڑ سے تعبیر کیا ہے۔

ایک اور مقام پر اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ زاہد الراشدی صاحب رقمطراز ہیں:

''ایک صاحب علم دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ علمی تفردات میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے پیچھے نہیں ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کے تفردات علماء کے حلقہ میں اس شدت کے ساتھ موضوع بحث نہیں بنے جس شدت کے ساتھ مولانا مودودیؒ کے افکار کو نشانہ بنایا گیا؟ میں نے عرض کیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا سندھیؒ اور ابوالکلام آزادؒ کے علمی تفردات پر ان کے شاگردوں اور معتقدین نے دفاع اور ہر حال میں انہیں صحیح ثابت کرنے کی وہ روش اختیار نہیں کی جو خود مولانا مودودیؒ اور ان کے رفقا نے ان کی تحریروں پر علماء کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات پر اپنائی تھی، چنانچہ اس روش کے نتیجے میں وہ جمہور علماء کے مدمقابل ایک فریق کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے اور بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔'' (عصر حاضر میں اجتہاد، صفحہ ۳۱۹)

مولانا راشدی ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بعض افکار و نظریات اور دینی تعبیرات سے جمہور علماء کو اختلاف رہا ہے۔ اس کا اظہار شدت اور نرم روی کے دونوں لہجوں میں خاصا ہوا ہے اور اس کے دفاع میں بھی دونوں اسلوب یکساں کارفرما چلے آ رہے ہیں، جبکہ ہم اس معاملہ میں موقف کے حوالے بہر حال جمہور اہل علم کے ساتھ ہیں۔'' (الشریعہ، جولائی ۲۰۱۳ء)

مولانا راشدی اس رائے میں متفرد بھی نہیں ہیں، بلکہ کئی دیگر اکابر علماء دیوبند کی آراء بھی ایسی ہی ہیں۔ مثلاً محدث العصر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے کے داماد اور معتمد خاص، فاضل دیوبند اور مؤلف ''انوار الباری'' حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

''ہم مولانا مودودی صاحب کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ اور جدید مسائل کو دل نشین اور مدلل طرز میں